© rasailojaraid.com

فہم قرآن

قرآن روشنی ہے

مسعود مفتی

میں نے سات ماہ مشرقی پاکستان میں بسر کیے۔ ایک ماہ بنگلہ دیش میں گزارا اور پھر دو سال بریلی میں بھارت کا قیدی رہا۔ یہ تاریک دن تھے اور انھی دنوں میں قرآن پاک نے اپنی روشنی ثابت کی جس کی ہلکی سی جھلک آج آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

مگر پہلے یہ عرض کر دوں کہ تاریکی سے کیا مراد ہے؟ وہ تاریک دن تھے اور ان کی تاریکی کئی سطح پر تھی۔

پہلی سطح یہ تھی کہ یہ ملت اسلامیہ کے لیے تاریخ کا دوسرا تاریک دور تھا۔ اسلامی تاریخ کا پہلا تاریک دور وہ تھا جب آٹھ سو سال کی حکومت کے بعد ہسپانیہ سے مسلمانوں کا نام تک مٹ گیا تھا۔ مسجدیں خاموش ہو گئی تھیں۔ کلمہ گو تہ تیغ کر دیے گئے تھے۔ نماز کی ممانعت ہو گئی تھی اور جان بچانے کا واحد ذریعہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرنا تھا۔ مشرقی پاکستان میں ہم نے انھی خدشات کے سائے بڑھتے ہوئے محسوس کیے تھے۔ خاکم بدہن مگر حقیقت یہ ہے کہ آج اس برعظیم میں ہندو وہی ڈرامہ کھیلنا چاہتا ہے جو پندرھویں اور سولھویں صدی میں سپین میں کھیلا گیا۔ ۱۹۴۸ میں بھارت نے ایک خاص مشن سپین بھیجا تھا جس کا مقصد یہ مطالعہ کرنا تھا کہ اسلام کو اس سرزمین سے کیسے ختم کیا گیا تاکہ اسی چیز کو یہاں بھی دھرایا جا سکے۔ ہسپانیہ بنیادی طور پر نفاق اور غداری کا شکار ہوا اور بھارت نے بڑے دھیمے مگر موثر انداز میں نفاق کے بیج ہمارے ہاں پھیلائے' اور پھر صورت حال بالکل ویسی ہی ہو گئی جیسی کہ ہسپانیہ میں تھی کہ جب فرڈی نینڈ نے اسلامی شہر ملاغہ فتح کیا تو مسلمان حاکم ابو عبدل نے اسے مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ ۱۹۷۱ میں ابو عبدل کی روح زندہ ہو گئی اور بنگالی قومیت کا بھیس بدل کر بھارت کی ہر کامیابی پر سرشار ہونے لگی۔ اس روح کی زندگی ہمارے لیے تاریکی تھی۔

تاریکی کی دوسری سطح اس برعظیم کے مسلمانوں کی سطح تھی۔ اس لیے کہ وہ ایک تاریک اور طویل عمل کا سیاہ ترین حصہ تھے۔ وہ عمل جو ۱۰۲۶ میں سومنات کی فتح سے شروع ہوا تھا' ۱۹۷۱ میں بالکل پلٹ گیا۔ ۱۰۲۶ میں بت سرنگوں ہوئے تھے اور ۱۹۷۱ میں بت شکن سرنگوں ہوئے۔ ۱۹۷۱ کا سال قریباً ایک ہزار سال بعد بت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرستوں کا بت شکنوں سے پہلا بھرپور بدلہ تھا اور یہ بدلہ اس لیے ممکن ہو سکا کہ قریباً اڑھائی سو سال پہلے ۱۷۰۷ میں اورنگ زیب کی وفات کے بعد اس برعظیم میں ملت اسلامیہ کا جو زوال شروع ہوا تھا، وہ بلا روک ٹوک جاری رہا۔ اورنگ زیب کے بعد چاروں بیٹوں کی تخت نشینی کی جنگ، سید بھائیوں کی بادشاہ گری، محمد شاہ رنگیلا کے دور میں مختلف صوبوں کی خود مختاری، جنگ پلاسی، مرہٹوں کا عروج اور شاہ دہلی کی بے بسی، بادشاہ دہلی شاہ عالم کا اندھا کیا جانا، پنجاب میں سکھوں کا عروج، دہلی پر لارڈ لیک کا حملہ اور بالآخر ۱۸۵۷ کا خونیں ڈراپ سین، اس مسلسل زوال کی کڑیاں تھیں اور بالآخر اسلامی سلطنت کا چراغ اس برعظیم میں گل ہو گیا۔ ۱۹۴۷ میں جب یہ نعرہ لگا "پاکستان کا مطلب کیا ہے، لا الٰہ الا اللہ" تو یہ خیال پیدا ہوا کہ پاکستان بننے کے بعد اب اسلامیان ہند کا ستارہ پھر سے روشن ہونے کو ہے مگر جب ہم نے اپنے نظریاتی رنگ کو پس پشت ڈال دیا اور بھرپور منافقت سے زبانی جمع خرچ شروع کیا تو تاریخ سسکیاں بھرنے لگی کہ زوال کا عمل تو اب بھی جاری ہے اور تاریخ کی گونج سے ہم بھی سہم گئے۔ پھر تاریخ نے یاد دلایا کہ ہسپانیہ میں غرناطہ کا سقوط ۱۴۹۲ میں ہوا اور وہاں کے آخری مسلمان نے ۱۶۱۰ میں سانس لینا بند کیا۔ گویا ہسپانیہ کی سرزمین میں اسلام کی آخری ہچکی کو ۱۱۸ برس لگے اور ہم سوچتے کہ کیا ان دو صدیوں کو ہم بھی اسلامیان برعظیم کی آخری ہچکی کا دور سمجھیں۔ یہ خیال اتنا کرب ناک تھا کہ ہم اتھاہ تاریکیوں میں ڈوبتے گئے۔

تاریکی کی تیسری سطح پاکستانی قوم اور وطن کی سطح تھی۔ اس قوم کی جس نے ۱۹۴۰ سے ۱۹۴۷ تک کے مختصر عرصے میں وطن حاصل کیا اور حاصل کرتے ہی بھول گئی کہ کیوں حاصل کیا تھا۔ آگہی سے چلی، نا آگہی میں بھٹک گئی۔ منزل مراد پر دم بھر کو رکی، پھر نامرادی کے راستے ہو لی۔ راستے میں یقین کی لاٹھی گم کر دی اور مایوسی میں گم ہو گئی۔ جمعیت پارہ پارہ، کارواں فرد فرد۔ اشتراک کیا تو صرف اتنا کہ سب مل کر قومی مفاد کو دفن کر سکیں۔ اقدار مٹی میں ملائیں، نفسا نفسی کو ایمان بنایا اور بالآخر قوم کی حالت اس کشتی کے مسافروں کی سی ہو گئی جو طوفان میں گھری ہے۔ اوپر بارش، نیچے لہریں۔ مگر ہر مسافر محض اپنے سر کو بارش سے بچانے کے لیے کشتی کے فرش کا تختہ اکھاڑ کر اپنے سر پر آڑ کر لیتا ہے اور سوچتا ہے کہ سفر بخیر ہو گا۔

شیخ سعدیؒ نے کہا ہے کہ تین چیزوں کو بقا نہیں۔ مال کو تجارت کے بغیر، علم کو بحث کے بغیر اور ملک کو تدبیر کے بغیر۔ وطن حاصل کرتے ہی ہم نے اس کا نام مملکت خداداد رکھ دیا اور تدبیر کو چھٹی دے دی۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۱ میں بھی میر کارواں نے وطن کو بچانے کی کوئی تدبیر نہ کی۔ بہت کیا تو تساہل کو تدبیر کہہ ڈالا اور حماقتوں کو نوشتہ تقدیر سمجھ لیا۔ رہبروں کی مسلسل خود ستائی، رہرووں کی مسلسل خود فریبی، رہزنوں کی مسلسل خود نمائی اور راست گووں کی مسلسل خودکشی سے قوم اور وطن ایسے مقام پر پہنچ گئے تھے جہاں تاریکی کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ تہی دامنی کے اس احساس کے ساتھ ہم تاریخ کے چوراہے میں حیران و پریشان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کھڑے تھے۔

تاریکی کی چوتھی سطح فرد کی سطح تھی۔ ان دنوں مشرقی پاکستان میں ہر فرد بے بسی اور بے چارگی کی مکمل تصویر تھا۔ امید تھک ہار چکی تھی، خدا ناراض لگتا تھا، سیاست مفلوج تھی، رہبروں پر رہزنی کا گمان گزرتا تھا، گردوپیش سازشیں تھیں، ماحول میں تناؤ اور ہیجان تھا۔ ہمسائے بھی ایک دوسرے کو شک کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ دھماکے برات کے گولوں کی طرح تھے۔ گولیاں فضا میں پنچھی پکھیروں کی طرح اڑتی تھیں۔ خون کے چھینٹے پان کی پیک کی طرح عام تھے۔ ہر ذی روح کی نس نس میں خوف و ہراس رچا تھا جس سے زبانیں گنگ تھیں اور کوئی دل کھول کر بات نہ کر سکتا تھا۔ ہر شخص ہر لمحے کی اوٹ میں موت کا سایہ دیکھتا تھا۔ بعض لوگوں کے لیے بعض دوسرے لوگ عزرائیل بنے تھے، بنگالی کے لیے ہر فوجی، بہاری کے لیے ہر بنگالی، مغربی پاکستانی کے لیے ہر مکتی باہنی والا اور سب کے لیے وہ نامعلوم پر اسرار شخص جو کسی بھی جگہ کسی بھی وقت بم رکھ سکتا تھا۔ ایک وقت کے ہنستے بولتے چہرے دوسرے وقت مر چکے ہوتے تھے یا گرفتار ہو چکے ہوتے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ اس کے ساتھ اگلے لمحے کیا ہونے والا ہے اور وہ موت کو معمول اور اپنی زندگی کو خلاف معمول سمجھتا تھا۔ بعدازاں جنگ آئی، شکست دیکھی، قیدی بنے مگر اس انفرادی نفسیات میں کوئی فرق نہ پڑا۔ فقط واقعات، حادثات اور خطرات نے نئے نقاب پہن لیے۔

طرز فغاں ہو کہ طرز بیاں، دونوں ایک ربط چاہتے ہیں تاکہ سننے والا سمجھ سکے۔ اس لیے ایک ایک نقطہ علیحدہ علیحدہ بتانا پڑتا ہے جو پورے دکھ یا جذبے کا محض ایک حصہ ہوتا ہے۔ اس طرح میں نے تاریکی کے چار پہلو، بیان کی ضرورتوں کے تحت گنوائے ہیں۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ شش جہت اور گھمبیر تاریکی تھی جو اتھاہ تھی، اٹوٹ تھی، پیچ در پیچ تھی اور بھنور در بھنور تھی۔ اس میں آنکھ بے کار اور فہم لاچار تھا۔

میں اسے بار بار تاریکی اس لیے کہہ رہا ہوں کہ وہ فارمولے ماؤف اور موقوف ہو چکے تھے جو ہمیں عام زندگی میں بصیرت اور روشنی دیتے ہیں۔ اس ماحول میں گھرا ہوا فرد کوئی بھی روایتی پیمانہ اٹھا کر حالات کا تجزیہ کرتا تو بہت جلد مایوس ہو جاتا، کیونکہ پیمانہ یا تو ناکافی ثابت ہوتا یا غیر متعلق۔ وہاں ہر لمحے کی آستین میں کئی فتنے تھے اور ہر فتنے کے کئی پہلو تھے اور ہر پہلو کی کئی قسمیں تھیں جو ان تمام پیمانوں کے لیے اجنبی تھیں۔ مذہب، اخلاقیات، عام اقدار اور حیات کے تمام فلسفے تقدیر کی گردش میں ڈوبتے نظر آتے تھے اور تقدیر ایک ان بوجھی پہیلی کی طرح سب کے اعصاب پر چھائی تھی۔ طاقتور، منہ زور اور بے قابو حالات کے سامنے ہر فرد اپنے آپ کو انتہائی حقیر اور بے بس محسوس کرتا تھا۔ فرد کا زمان و مکان سے رشتہ اس حد تک ٹوٹ چکا تھا کہ پوری کائنات بے مقصد لگتی تھی اور زندگی بے معنی، جو ہوا کے خفیف جھونکے کی طرح ابھی ہے اور ابھی نہیں ہے۔ حالات کبھی تندرو تھے اور کبھی سست رو مگر ان کی گرد راہ سے ذہن میں ایسے ایسے سوالات پیدا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوتے تھے جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ مستور تقدیر جب بے نقاب ہو جائے تو مجبوب ذہن بے باک ہو جاتے ہیں۔ ان کی سوچ میں اپنا گریبان چاک کرنے والی بے صبری بھی ہوتی ہے اور دامن یزداں چاک کرنے والے گستاخی بھی۔ ان سوچوں سے نکلے ہوئے سوالات وعدۂ فردا پر نہیں ٹل سکتے تھے، وہ جواب چاہتے ہیں--- فوری اور مکمل۔ اور جب جواب نہ ملے تو یہ پریشان ذہن تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں۔ جب میں یہ کہتا ہوں کہ وہ تاریک دن تھے تو میری مراد ایسی ہی تاریکی سے ہے۔

مشرقی پاکستان کی خوں ریز قیامتوں اور جنگ کے ہنگاموں میں تو ہم نے اپنی ذات کی حد تک سوچا مگر قید کی بے خواب راتوں میں غالب کے کہنے کے مطابق خیال بھی بیابان نورد ہو گئے۔ سوچوں کا دائرہ ذات سے پھیلا تو کائنات تک گیا اور اس کائنات میں انسان کی حیثیت تک گیا۔ سوچا ہم نے مگر سمجھا اقبال کی زبان میں کہ:۔

مکانی ہوں کہ آزاد مکاں ہوں　　جہاں میں ہوں کہ خود سارا جہاں ہوں
وہ اپنی لامکانی میں رہیں مست　　مجھے اتنا بتا دیں میں کہاں ہوں

منظم اور متحرک کائنات کی لامحدود وسعتوں میں رینگنے والا انسان انتہائی حقیر لگتا اور یہ چند سالہ زندگی بالکل بلامقصد لگتی۔ بقول غالب ؎

ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہم سوچتے کہ ہم ہوئے تو کیا ہوا۔ نہ ہوتے تو کیا فرق پڑتا۔ ہمیں غیر موجود سے موجود میں لا کر پھر غیر موجود میں لے جانے کے کیا معنی؟ بقول فانی:۔

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم　　رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم

اور ہمارے ہونے کے بھی کیا انداز؟ کہ ورود تو ایسے کہ:؎

میں خود آیا نہیں لایا گیا ہوں

اور وداع ایسے کہ:؎

بھری محفل سے اٹھوایا گیا ہوں

اور ان دو کے درمیان زندگی کا یہ انداز کہ:؎

اسیر جسم ہوں میعاد قید نامعلوم

اللہ اور اس کے بندے کے رشتوں سے نظر ہٹتی تو بندے اور بندے کے رشتوں میں جا الجھتی۔ خاردار تاروں میں گھرا ہوا مختصر سا کیمپ، انسانی رشتوں کی شکست و ریخت کے مطالعے کی لیبارٹری تھا۔ اس میں انسانی فطرت کو اس کی بدترین اور بہترین شکل میں دیکھا جا سکتا تھا۔ ہم مختار نہ تھے بلکہ مجبور تھے، آزاد نہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تھے بلکہ محبوس تھے۔ ضروریات کم تھیں مگر وسائل کم تر تھے۔ مقصد حیات سکڑ کر محض اپنی بقا رہ گیا تھا۔ اس لیے سارے جذبے انتہائی شدید شکل میں نظر آتے تھے۔ خود ترسی بھی شدید تھی اور خود غرضی بھی۔ غیروں سے مجروح شدہ انا اپنوں میں بہت مغرور تھی۔ اس لیے عام زندگی میں اچھائی اور برائی کے تصادم کا جو تناسب نظر آتا ہے، وہ بھی کیمپ میں نسبتاً شدید شکل میں نظر آتا تھا اور ہم سوچنے پر مجبور ہو جاتے تھے کہ نیکی اور بدی کے ازلی اور ابدی تصادم میں بدی کیوں زیادہ تر حاوی رہتی ہے؟ یہ سوال صرف باہمی رشتوں کی رگڑ سے نہ اٹھتا تھا بلکہ جب ہم خاردار تاروں کے باہر ہندستانیوں کو دیکھتے تو اور بھی تکلیف دہ بن کر ذہن کو کریدتا۔ ہندو نے چالاکی، مکاری اور جارحیت سے پاکستان کو دو ٹکڑے کیا۔ اب ترانوے ہزار لوگوں کو غیر قانونی اور غیر اخلاقی طور پر محض دھونس سے یرغمال بنا رکھا تھا اور پھر بھی دنیا والے اس کا دم بھرتے تھے۔ ہم سوچتے کہ اس دنیا میں خدا نے بدی اور جھوٹ کی قوتوں کا پلڑا بھاری کیوں رکھا ہے؟

میں نے سوالوں کے گتھے ہوئے گنجلک میں سے صرف چند سوال آپ کے سامنے رکھے ہیں، لیکن اگر آپ ہمارے پورے کرب اور کرید کا تصور کریں تو آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ غیر معمولی حالات، غیر معمولی سوالات کو جنم دیتے ہیں اور ان کا غیر معمولی اثر یہ تھا کہ ہمارا یقین ہر چیز سے ڈول گیا تھا۔ تمام عقیدے لڑکھڑانے لگے تھے یا دیگر الفاظ میں یوں سمجھیے گا کہ اندھے کے ہاتھ سے لاٹھی گر گئی تھی اور ہم مکمل تاریکی میں تھے۔

ایسے وقت میں مجھے قرآن سے روشنی ملی۔

ہمارے مختصر سے کیمپ میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ ایک گروپ عبادت گزار لوگوں کا تھا، جو اپنا زیادہ تر وقت نماز ادا کرنے، قرآن خوانی، آیات کریمہ کے ورد اور ختم قرآن میں گزارتا تھا۔ دوسرا گروپ ان لوگوں کا تھا جو پہلے گروپ کے ساتھ ساتھ چلتا تھا مگر ان کی عبادت میں وہ شدت نہ تھی۔ گو دعاؤں میں وہی خلوص تھا۔ تیسرا گروپ ان لوگوں کا تھا جو مذہب کے دلدادہ نہ تھے بلکہ ان میں سے دو ایک تو بالکل مخالف تھے.... میں دوسرے گروپ سے تعلق رکھتا تھا۔

ہم سب آپس میں ان سوالوں پر اکثر بحث کیا کرتے تھے جن سوالوں کا میں ذکر کر چکا ہوں اور ہر گروپ کا انداز فکر، طرز استدلال اور جذباتی شدت مختلف ہوتی۔ پہلے گروپ والے ان سوالات کو پسند نہ کرتے تھے۔ دوسرے گروپ والے کھلے ذہن سے غور کرتے اور تیسرے گروپ والے انھیں خوب خوب اچھالتے۔

ابھی غور و بحث کا یہ سلسلہ جاری تھا کہ پہلے گروپ والے ایک دوست نے مجھے ایک دن تنہائی میں بڑے خلوص سے سمجھایا کہ ان چیزوں کے متعلق مت سوچا کرو۔ مجھے خطرہ ہے کہ تم بھی گمراہ ہو جاؤ گے اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

انھوں نے سورہ المائدہ کی آیات نمبر ۱۰۱ اور ۱۰۲ بتائیں:

"اے ایمان والو! ان چیزوں کے متعلق سوال مت کرو جنھیں سمجھ کر تم تکلیف اٹھاؤ گے"۔

"تم سے پہلے بھی بعض لوگوں نے یہ سوالات پوچھے تھے اور گمراہ ہو گئے تھے"۔

گویا انھوں نے فیصلہ سنا دیا: ع

آزادی افکار ہے ابلیس کی ایجاد

اپنے دوست کی اس بات سے میں بہت پریشان ہوا۔ یوں لگا کہ میں تاریکی میں سے باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہوں مگر اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور وہ تاریکی اتھاہ بن گئی ہے۔ چند دن تک میں انتہائی پریشان ہوتا رہا اور سوچتا رہا کہ کیا کروں؟

ہمارے کیمپ میں ترجمے والے دو تین قرآن مجید تھے۔ دو تو اردو ترجمے تھے جن میں سے ایک جناب سید عبدالقادرؒ صاحب کا تھا اور دوسرا جناب عبداللہ یوسف علیؒ صاحب کا انگریزی ترجمہ۔ ان نسخوں کو ہمارے کیمپ کے ساتھی باری باری پڑھا کرتے تھے۔ مختلف لوگوں نے مختلف اوقات بنا رکھے تھے۔ میں بھی ان میں شامل ہو گیا۔ تھوڑا عرصہ بالترتیب پارہ پارہ پڑھا۔ مگر بعد میں یہ طریقہ چھوڑ دیا اور جب کبھی کوئی سوچ زیادہ تنگ کرتی تو قرآن مجید کی ورق گردانی کر کے مختلف مقامات سے اس کا جواب ڈھونڈنے کی کوشش کرتا۔

میرا سب سے پہلا سہارا سورہ نحل کی آیت نمبر ۶۹ تھی جس میں خدائے تعالیٰ نے شہد کی مکھی کی مثال دے کر فرمایا کہ یہ ایک مثال ہے ان لوگوں کے لیے جو غور کرتے ہیں۔ پھر ایسے ہی فقرے بار بار نظر سے گزرے اور یتفکرون کے لفظ کی تکرار سے غور و فکر کرنے والے اصحاب کی نشان دہی کی گئی ہے۔ خود قرآن کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ کتاب الحکیم ہے اور "قرآن مبین" ہے جو حکمت والی کتاب ہے اور چیزوں کو واضح کرتی ہے۔ اسی وضاحت کے لیے مکڑی کے جالے کی مثال دی گئی ہے (العنکبوت ۲۹:۴۱-۲)، جھوٹے خداؤں اور مکھی کی مثال دی گئی ہے (الحج ۲۲:۷۳)، گدھے کی مثال دی گئی ہے (الفتح ۴۸:۲۴)، اور سوت کاتنے والی عورت کی مثال دی گئی ہے (النحل ۱۶:۹۲)۔ یہ مثالیں غور و فکر کی دعوت دیتی ہیں۔ انسان کو سوچنے پر مجبور کرتی ہیں اور روشن ضمیری کے ساتھ ساتھ روشن دماغی کو بھی جائز قرار دیتی ہیں۔

یہ احساس میرے لیے اس تاریکی میں روشنی کی پہلی کرن تھی جس سے میرے لڑکھڑاتے ہوئے یقین کو بڑی ہی تقویت پہنچی۔ اس کرن کا براہ راست اثر یہ ہوا کہ کیمپ میں پہلے گروپ سے میرا جذباتی رشتہ تو قائم رہا مگر ذہنی رشتہ ٹوٹ گیا۔ پھر جیسے جیسے وقت گزرتا گیا، قرآن خوانی کی محفلوں میں میری شرکت کم ہوتی گئی اور اکیلے میں قرآن فہمی کی کوشش زیادہ ہوتی گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے گروپ والے دوستوں میں سے بعض کو یقین آ گیا کہ میں گمراہ ہو گیا ہوں اور ان کا ساتھ چھوڑ چکا ہوں، مگر ان کا الزام سن کر میں صرف مسکرا دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقطۂ ۴

کیا صوفی و ملا کو خبر میرے جنوں کی

میں پہلے عرض کر چکا ہوں کہ ہماری تاریکی کے کئی پہلو اور کئی سطحیں تھیں۔ ان میں سے تین واضح تھے: ملت اسلامیہ کے متعلق پریشانی' اسلامیان برعظیم کے متعلق پریشانی اور پاکستانی قوم کے متعلق پریشانی۔ اس پریشانی کے تحت ہم اپنی قوم کا دوسری قوموں سے مقابلہ کرتے اور اپنے آپ کو مظلوم گردانتے ہوئے اقبال کے انداز میں شکوہ کرتے :۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

مگر جب بار بار قرآن میں جھانکا تو خود ترسی پگھل کر خود بینی میں ڈھلنے لگی جس نے بالآخر خود ملامتی کا روپ دھار لیا کیونکہ قرآن پاک نے قوموں کے اجتماعی طرز عمل کا نہایت واضح انداز میں تجزیہ کیا ہے۔ ہر شخص اپنے مخصوص حالات کی وجہ سے فرد کے بیان میں تشنگی محسوس کر سکتا ہے مگر قوموں کے بیان میں تشنگی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ انسان کی ابتدا سے لے کر نزول قرآن تک وقت کے پردے پر متعدد قوموں کے زوال کی تصویر دیکھنے میں آتی ہے اور قاری کو یہ احساس ہوتا ہے کہ خدائے تعالیٰ نے ریاضی کے فارمولوں کی طرح چند بنیادی اصول بتائے ہیں جن پر قوموں کی حیات و موت کا دارومدار ہے۔

سب سے پہلا اصول سورہ انبیاء میں بتایا گیا ہے:

وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا لٰعِبِيْنَ (الانبیاء ۲۱:۱۶)' "ہم نے زمین اور آسمان کو کھیل یا مذاق کے طور پر نہیں بنایا"۔

یہ وہی بات ہے جو ہماری سائنس بھی سمجھاتی ہے کہ کائنات میں ایک سکیم' تنظیم اور نظم و ضبط ہے اور قرآن کریم میں بار بار ولو شاء اللہ کا جملہ استعمال کیا گیا ہے۔ "یعنی اگر اللہ چاہتا" جو وضاحت کرتا ہے کہ دنیا جیسی بھی ہے اس کو بنانے میں خدائے تعالیٰ کے دانستہ ارادے کا دخل ہے۔ اگر خدا چاہتا تو اسی کائنات کو دیگر انداز میں بھی بنا سکتا تھا مگر ایسا نہیں کیا کیونکہ یہ سب کچھ ایک خاص سکیم کے تحت ہے۔

دوسرا اصول سورہ الاعراف میں نظر آتا ہے:

اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ - يُوْرِثُهَا مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ - وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ (الاعراف ۷:۱۲۸)' "بلاشبہ زمین اللہ کی ملکیت ہے۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام متقیوں کے لیے ہے"۔

یہ اصول اس سکیم کا بنیادی عنصر ہے جسے اقبال نے ایک مصرعے میں یوں سمویا ہے:

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ محض ایک قرآنی آیت ہی نہیں ہے بلکہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جس قوم نے بھی مومن جیسی خصوصیات پیدا کرلیں، وہ بلالحاظ مذہب و ملت دوسری قوموں پر غالب ہوئی۔ یہ خصوصیات ہیں: دیانت داری، محنت، اخلاقی جرات اور خلوص جب کہ شکست کھانے والی خصوصیات ہیں: منافقت، کاہلی اور بے یقینی۔

تیسرا اصول بھی اسی سے پیدا ہوتا ہے کہ جب قوم کا کردار بگڑ جاتا ہے تو بالکل ریاضی کے فارمولے کے انداز میں وہ زندہ رہنے کا حق کھو دیتی ہے۔ سورہ انعام میں واضح ارشاد ہے:

اَلَمْ يَرَوْا كَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّنْ لَّكُمْ وَاَرْسَلْنَا السَّمَآءَ عَلَيْهِمْ مِّدْرَارًا وَّجَعَلْنَا الْاَنْهٰرَ تَجْرِىْ مِنْ تَحْتِهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَنْشَاْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ قَرْنًا اٰخَرِيْنَ (الانعام ۶:۶)، "کیا وہ دیکھتے نہیں کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قومیں تباہ کی ہیں۔ ایسی نسلیں جو روے زمین پر ان سے بھی زیادہ طاقت ور تھیں۔ ہم نے ان پر باران رحمت کی اور پاؤں تلے زرخیز ندیاں دیں۔ مگر ان کے گناہوں کی وجہ سے انھیں تباہ کیا اور ان کے بجائے نئی قومیں پیدا کیں"۔

چوتھا اصول یہ ہے کہ ان قوموں کی سلسلہ وار ہلاکت سے آنے والی نسلیں سبق سیکھ سکتی ہیں اور حقیقت معلوم کر سکتی ہیں۔ سورہ الحاقہ کی پہلی گیارہ آیات اس اصول کو بڑے خوب صورت انداز میں پیش کرتی ہیں کہ اگر تم اصل حقیقت اور سچائی کو پہچاننا چاہتے ہو تو قوم ثمود اور قوم عاد کی ہلاکت کو دیکھو اور طوفان نوح کی تباہ کاریوں کو دیکھو اور بارھویں آیت میں ارشاد ہے کہ ان کا تذکرہ تمھارے لیے ایک سبق ہے۔

پانچواں اصول ایک تنبیہ کی طرح سارے قرآن میں بکھرا ہوا ہے۔ اس کی صرف تین مثالیں پیش کرتا ہوں:

سورہ الحجر میں ارشاد ہے: وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ مَّعْلُوْمٌ (الحجر ۱۵:۴)، "ہم نے کبھی کسی قوم کو ہلاک نہیں کیا۔ تاوقتیکہ اس کو زندگی کا مقررہ موقع نہیں دیتے"۔

اسی طرح سورہ نحل میں درج ہے: وَلَوْ يُؤَاخِذُ اللّٰهُ النَّاسَ بِظُلْمِهِمْ مَّا تَرَكَ عَلَيْهَا مِنْ دَآبَّةٍ وَّلٰكِنْ يُّؤَخِّرُهُمْ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ (النحل ۱۶:۶۱)، "اگر اللہ انسانوں کو ہر گناہ کی سزا دیتا تو زمین پر ایک نفس بھی زندہ نہ بچتا۔ مگر وہ ان کو ایک معینہ مدت کے لیے مہلت دیتا ہے۔ جب وہ مہلت ختم ہوتی ہے تو ایک ساعت کی تاخیر کے بغیر سزا دیتا ہے"۔

پھر سورہ اعراف میں ارشاد ہے: وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۔ فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً (الاعراف ۷:۳۴)، "ہر قوم کو ایک وقت دیا جاتا ہے جب ان کی میعاد ختم ہوتی ہے تو اس میں کوئی اضافہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں کیا جا سکتا"۔

ان اصولوں کی مزید وضاحت ان چھ قوموں کی تباہی سے ہوتی ہے جن کا قرآن میں بار بار ذکر ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم طوفان کے ذریعے تباہ ہوئی۔ انھوں نے نہ صرف پیغمبر کی نافرمانی کی بلکہ اپنی دنیاوی دولت کے نشے میں نوح پر پھبتیاں کسیں کہ تم غریبوں کو اپنی جماعت سے خارج کر دو تو ہم تمھارا ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ یعنی انھوں نے اطاعت کو سماجی طبقوں کی شرط کے تابع بنا کر ایمان اور خلوص کا مذاق اڑایا۔ حضرت ہود علیہ السلام کی قوم عاد اس لیے تباہ ہوئی کہ مالی خوش حالی کے نشے میں لوگ خدا کو خاطر میں نہیں لاتے تھے اور ان کے پر غرور محلات' مرغزار اور نہریں آندھی میں ٹوٹ پھوٹ گئے۔ حضرت صالحؑ کی قوم ثمود مادی دولت کی حرص میں انسانیت سے اس حد تک خالی ہو گئی کہ اس خشک علاقے میں وہ لوگ جن کا پانی پر قبضہ تھا' دوسروں کو پانی استعمال نہ کرنے دیتے تھے۔ حضرت صالحؑ نے فرمایا کہ پانی اور چراگاہیں خدا کا آزادانہ عطیہ ہیں اور ایک اونٹنی کو کھلا چھوڑ دیا تاکہ یقین ہو سکے کہ جانوروں کی نقل و حرکت پر کوئی پابندی نہیں۔ مگر مادی دولت کی حرص میں ڈوبے ہوئے لوگوں نے اس اونٹنی کو قتل کر دیا اور وہ قوم بالآخر زلزلے سے تباہ ہوئی---- حضرت لوطؑ کی قوم اپنی فحاشی کی وجہ سے آگ اور پتھر کے طوفان سے تباہ ہوئی---- حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین اس لیے تباہ ہوئی کہ وہ کم تولتے تھے۔ شاہراہ پر ڈاکے ڈالتے تھے۔ باہمی نفاق رکھتے تھے اور غلط ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو مذہبی کاموں پر خرچ کرتے تھے.... بنی اسرائیل کی تباہی اس لیے ہوئی کہ وہ سچ اور جھوٹ کو ملاتے تھے۔ خدا کی نعمتوں کی ناشکری کرتے تھے۔ خدا کے احکام کی تعمیل میں حجت بازی کرتے تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے عہد سے بدعہدی کرتے تھے اور مسلسل منافقت سے کام لیتے تھے۔ انھوں نے سامری کے بچھڑے کی پوجا کر کے شرک کیا۔ ارض مقدس پر حملہ کرنے سے انکار کر کے نافرمانی کی۔ ان پر جب سزا کے لیے ٹڈی دل' مینڈک اور خون وغیرہ کی وبائیں نازل کی گئیں تو انھوں نے توبہ کی۔ مگر جب حضرت موسیٰؑ کی دعا پر یہ وبائیں دفع ہو گئیں تو وہ پھر منکر ہو گئے۔

جس وقت میں قرآن مجید میں یہ واقعات پڑھتا تھا' تو میرا مسکن ایک بے رونق اور ویران کمرہ تھا۔ میرے اردگرد خاردار تار' بندوقیں اور سنگینیں تھیں۔ فضا میں دشمن کی خوں خوار نظریں تھیں۔ ذہن میں خاک و خون کی یادیں تھیں۔ آنکھوں کے سامنے اپنی فوج کی شکست کے مناظر تھے۔ دل پر بھارتیوں کے ہاتھوں اپنی قوم کی ذلت کے زخم تھے۔ لاشعور میں اس برعظیم کے مسلمانوں کی ہزار سالہ حکومت اور دو سو سالہ زوال تھا۔ ہاتھوں میں قوموں کے بننے اور بگڑنے کی داستانیں تھیں جن پر خدا کے غضب کے تازیانے صاف نظر آتے تھے اور شش جہت وہ تاریکیاں تھیں جن کا پہلے ذکر کر چکا ہوں۔

ماحول کا ہر تار و پود جب ناموافق نظر آتا تو اداس اور ویران کمرے کی گھٹن میں' میں اپنے من میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈوب جاتا اور رفتہ رفتہ مجھے یہ محسوس ہونے لگا کہ یہ قرآن پاک وہ کتاب نہیں جسے علامہ اقبال نے بڑے دکھ سے کہا تھا: ع

کتاب صوفی و ملا کی سادہ اوراق

بلکہ اس کے اوراق تو میرے گردوپیش چھائی ہوئی تاریکی میں شیشے کی مانند چمک رہے تھے۔ جب زیادہ غور سے پڑھا تو یہ شیشہ نہ رہا بلکہ روشن آئینہ بن گیا جس میں اپنی قوم کا چہرہ صاف نظر آنے لگا۔

اس چہرے کے خدوخال مجھے پکار پکار کر بتا رہے تھے کہ جو کچھ ہماری قوم کے ساتھ ہوا ہے، وہ وہی ہے جو ہونا چاہیے تھا بلکہ یہ بھی خداے تعالیٰ کا کرم ہے کہ کم ہوا ورنہ ریاضی کے ان فارمولوں کے مطابق تو بہت زیادہ ہو سکتا تھا۔

میں نے ایک دفعہ پھر ان اصولوں اور اپنی قوم کا موازنہ کیا تو بات روز روشن کی طرح واضح ہو گئی اور ہمارے گردوپیش جو سوال ناچتا رہتا تھا کہ قصور کیا ہے؟ وہ ٹوٹے تارے کی طرح ریزہ ریزہ ہو کر فضا میں بکھر گیا اور اس کی جگہ ایک واضح اور روشن جواب ابھرا۔

جواب یہ تھا کہ جن چھ قوموں کو خدا کی طرف سے سزا ملی، ان میں سے ہر ایک میں چند خرابیاں تھیں جو اس قوم کے لیے مخصوص تھیں مگر حیف یہ ہے کہ پاکستانی قوم میں مجموعی طور پر وہ تمام خرابیاں موجود ہیں، جو فرداً فرداً ہر قوم میں تھیں۔

ہمارا نعرہ یہ تھا "پاکستان کا مطلب کیا؟.... لا الٰہ الا اللہ" یہ صرف نعرہ نہ تھا بلکہ خدا اور دنیا کے ساتھ ایک وعدہ بھی تھا کہ ہم ان اقدار پر مبنی ایک معاشرہ تعمیر کرنے کے لیے ایک خطہ زمین چاہتے ہیں جس میں ہمارا اسلامی کلچر محفوظ رہ سکے۔ مگر یہ خطہ حاصل کر لینے کے بعد ہم ٹھیک بنی اسرائیل کے انداز میں بدعہدی کے مرتکب ہوئے۔ بنی اسرائیل نے سونے کے بچھڑے کی پوجا کر کے شرک کیا۔ ہم نے رات بھر میں امیر ہونے کی خواہش میں دولت کی پوجا اس انداز میں کی کہ شرک کے درجے تک پہنچ گئے۔ بنی اسرائیل کو تنبیہ ہوئی:

وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ (البقرہ ۲:۴۲)، "سچ کو جھوٹ سے نہ ڈھانکو اور سچ کو مت چھپاؤ جب تم جانتے ہو"۔

مگر یوں لگتا ہے کہ یہ تنبیہ عین ہمارے لیے گھڑی گئی کیونکہ ہمارے ہاں اخلاقی جرات کا اس قدر قحط ہے کہ سچ قسم کی چیز ہمارے معاشرے میں سے تقریباً ناپید ہوتی جا رہی ہے اور ہر مصلحت کوش زہر ہلاہل کو قند کہنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ بنی اسرائیل کی منافقت، ناشکری اور ناقدری ہمارے اپنے ماتھے کا پسینہ معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم مدین کو اس لیے سزا ملی کہ وہ کم تولتے تھے، شاہراہ پر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ڈاکے ڈالتے تھے اور ناجائز دولت کو مذہبی کاموں پر خرچ کرتے تھے اور آپس میں نفاق رکھتے تھے۔ ان چاروں برائیوں میں سے کون سی برائی ایسی ہے جو ہماری قوم میں اس قوم سے بڑھ چڑھ کر نہیں ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم کو نافرمانی کی سزا ملی مگر اس نافرمانی کی ایک شکل یہ بھی تھی کہ امیر لوگ حضرت نوحؑ سے کہتے تھے کہ آپ اپنے دین میں سے نچلے طبقے کے لوگوں کو خارج کر دیں۔ پاکستانی قوم نے اس طبقاتی رعونت کی لاتعداد مثالیں دیکھی ہیں۔ قوم عاد اور ثمود کو اس لیے سزا ملی کہ وہ دولت کی فراوانی اور شان و شکوہ کی دوڑ میں انسانیت گنوا بیٹھے۔ ہماری قوم بھی عرصے سے انسانیت کی لاش کے سرہانے بیٹھ کر دولت سمیٹنے میں مصروف ہے۔

قید کے دنوں میں گردوپیش کی تاریکی جب قرآن کی روشنی سے دور ہوئی تو اس آئینے میں اپنی قوم کا تاریک چہرہ نظر آیا جس پر مشرقی پاکستان کے المیے کی تفسیر اتنی واضح تھی کہ ملت اسلامیہ، اسلامیان برعظیم اور پاکستانی قوم کے متعلق میرے سارے سوالات دم توڑ گئے۔ میں سمجھ گیا کہ مشرقی پاکستان کی سرزمین سے نعرۂ تکبیر کیوں غائب ہو گیا تھا؟ اسلامی تاریخ کی سب سے بڑی شکست ہماری قوم پر کیوں پڑی تھی؟ ترانوے ہزار پاکستانی جنگی قیدی کیوں بنے تھے اور جب وہ پابجولاں لے جائے جا رہے تھے تو ان پر ان کے بھائیوں نے پتھراؤ کیوں کیا تھا؟ کیمپ میں ہمارے بچے ہماری آنکھوں کے سامنے دودھ کو کیوں ترستے رہے؟ شانتی پاڑا میں اجتماعی قبریں کیوں بنیں؟ بدی کی قوتیں ہم پر کیوں مسلط ہوئیں؟ بت شکنوں پر بت پرست کیوں غالب آئے؟

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ماضی میں تباہ ہونے والی قوموں کی جملہ برائیوں کو جب ہم نے اپنے دامن میں سمیٹ لیا تو ہمیں سزا دینا ناگزیر ہو گیا تھا۔ اس سزا میں سیاسی صدمہ بھی شامل کرنا تھا۔ جسمانی، ذہنی اور جذباتی صدمہ بھی شامل کرنا تھا۔ سماجی صدمہ بھی شامل کرنا تھا اور میں جو یزداں کا دامن پکڑ کر شکوہ کرنے اٹھا تھا، اپنی پیشانی سے شرمندگی پونچھتا ہوا بیٹھ گیا۔

یہاں تک مطمئن ہونے کے بعد اب میرے سامنے سوال کا دوسرا حصہ تھا کہ جب کسی قوم کو سزا دی جاتی ہے تو کیا وجہ ہے کہ بعض لوگ دوسرے بعض کے مقابلے میں زیادہ صدمہ اٹھاتے ہیں۔ کسی کے بچے پاکستان میں محفوظ ہیں اور کسی کے بچے کو کیمپ میں دودھ تک نہیں ملتا۔ علیٰ ہذا القیاس۔ اس کا بڑا ہی واضح جواب سورہ بقرہ میں ملا: وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۔ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ (البقرہ ۲:۱۵۵)، "ہم تمھیں آزمائیں گے خوف سے، بھوک سے، جان و مال کے نقصان سے۔ اور خوشخبری ہے ان لوگوں کے لیے جو صبر سے یہ سب جھیلتے ہیں"۔ اور پھر سورہ آل عمران میں ارشاد ہے: لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ (آل عمران ۳:۱۸۶)، "یقیناً مال اور جان سے تمھیں آزمایا جائے گا"۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان آیات کا مطالعہ میرے لیے بہت فکر انگیز ثابت ہوا۔ میں نے ماضی کو کھنگالا تو احساس ہوا کہ عین اس وقت جب میں بہت مسرور لمحے گزار رہا تھا' ہمارے گردوپیش کوئی نہ کوئی' کسی نہ کسی مصیبت میں گرفتار تھا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ میری آزمایش قید میں ہوئی۔ کسی کی غربت میں' کسی کی بھوک میں اور کسی کی کسی اور نقصان سے۔ جب دوسروں کی آزمایش ہو رہی تھی' میں خوش و خرم تھا اور میں نے ان کے حق میں خدا سے کوئی گلہ نہیں کیا تھا۔ اب میری آزمایش ہو رہی ہے اور دوسرے آرام سے ہیں۔ خدا کے پروگرام کے مطابق دوسروں کا حصہ دوسروں کو ملتا رہا اور میرا حصہ مجھے اب مل رہا ہے۔

مجھے افسوس ہے کہ وقت کی کمی کی وجہ سے مجھے انتہائی اختصار سے کام لینا پڑا اور میں فکرونظر کے اندیشوں کی پیچیدگیوں کو اتنی تفصیل سے بیان نہیں کر سکا جتنی ضرورت تھی۔ حکایتوں اور شکایتوں کا بیان ہمیشہ طوالت چاہتا ہے اور واردات قلبی کو سمجھانے کے لیے گریبان و دامن کے ہر تار اور گرہ کو الٹ پلٹ کر دکھانا پڑتا ہے۔ میں نے تو مثال کے طور پر تاریک دنوں میں چند سوچیں اور ان سے پیدا ہونے والے چند سوالات آپ کے سامنے رکھے ہیں اور روشنی ملنے کے عمل کی تشریح کی ہے۔ اس عمل کی وضاحت کے لیے صرف ایک مثال پیش کی ہے جو ہماری اجتماعی زندگی کے متعلق ہے اور جس سے سب کا مشترکہ رشتہ ہے۔ اپنی ذات یا فرد کی ذات کے مسئلے کو میں نے ابھی تک چھوا نہیں کیونکہ ایک تو وقت کی کمی ہے اور دوسرے ہر فرد کی ذات اپنے اندر ایک دنیا ہوتی ہے۔ پھر ہر فرد کی دنیا ہر دوسرے فرد کی دنیا سے الگ ہے۔ اس لیے ہر فرد کو بنیادی طور پر اپنا جواب خود ڈھونڈنا پڑتا ہے۔ پھر بھی ایک فرد اپنا تجربہ اور واردات دوسروں کے سامنے بیان کر سکتا ہے اور میں بھی کر سکتا ہوں مگر:ع

کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے

واردات قلبی کا وہ حصہ جو فرد اور ذات کے متعلق ہے' میں کسی دوسری تحریر میں بیان کر رہا ہوں۔ اس وقت گریز کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ فرد کے متعلق ابھی تک میرے کئی سوال تشنہ ہیں جیسا کہ میں شروع میں ہی عرض کر چکا ہوں کہ میرا ذہنی سفر ابھی ختم نہیں ہوا۔ بلکہ جاری ہے اور قرآن کے اوراق سے روشنی ڈھونڈنے کی کوشش جاری رہے گی۔ میں اپنا یہ مضمون سورہ ہود میں حضرت آدمؑ کی اس دعا پر ختم کرتا ہوں:

رَبِّ اِنِّیٓ اَعُوْذُبِکَ اَنْ اَسْئَلَکَ مَا لَیْسَ لِیْ بِہٖ عِلْمٌ۔ (ہود ۱۱:۴۷)

"اے ربّ' میں تیری پناہ چاہتا ہوں کہ میں بلاتردد اس بارے میں تجھ سے سوال کروں جس کے متعلق مجھے علم نہ ہو"۔

(تلخیص کی خاطر' کچھ حصے حذف کیے گئے ہیں۔ مضمون مصنف کی کتاب 'لمحے' میں شامل ہے۔ مدیر)

© rasailojaraid.com